ڈاکٹر سلیم اختر

معاشرہ اور تخلیق: کلچر کا تناظر

آلاتِ صوت یعنی زبان، تالو اور ہونٹوں کی مشترک حرکات کے نتیجہ میں ہوا مختلف آوازوں کے سانچے میں ڈھل کر حرف اور الفاظ کا روپ اختیار کر کے حسن بیان کی اساس بننے والی خوش رنگ تشبیہوں، نفیس استعاروں، کارآمد تمثالوں اور معنی کی مختلف جہات کی حامل علامات کی صورت میں تخلیقی فعلیت کو رنگ جمال عطا کر کے دِل کش اور دِل نشین بناتی ہے۔ حرف سازی کے عمل میں آلاتِ صوت کی کارکردگی بلکہ حسنِ کارکردگی کا شعوری طور پر احساس نہیں ہوتا لیکن زبان کی کارکردگی کی اساس ہوا پر استوار ہے، سانس رُکی تو الفاظ کا تاج محل منہدم، اگر ہم خلاء میں زیست کرتے ہوتے تو ہوا کی عدم موجودگی کے باعث بے زبانی ہے، زباں میری، جیسا عالم ہوتا۔

اعلیٰ ترین ادبی تخلیقات اپنی اساس میں ہوا کی شعبدہ بازی ہیں یعنی کارخانۂ تخلیق بردوش ہوا۔ شاید اسی لیے تحریر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہوا بُرد ہونے سے پہلے ہی الفاظ کو بذریعہ تحریر زمان و مکاں میں مقید کر لیا جائے، اپنے لیے اور آنے والی نسلوں کے لیے۔

عبرانی میں ہوا/ سانس کے لیے روح کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اگر ادب میں بھی الفاظ کے لیے روح کا لفظ استعمال کر کے دیکھیں تو بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچتی ہے۔ زبان اور ادب کے مقابلے میں ثقافت کا لفظ زیادہ اُلجھا ہوا ہے۔ ہمارے ہاں ابھی تک کلچر کے لیے درست اصطلاح کا تعین نہیں ہوسکا، تہذیب، تمدن، ثقافت وغیرہ۔ انگریزی میں کلچر

کے ضمن میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ میتھیو آرنلڈ کی ''کلچر اینڈ انارکی'' سے چلیں تو ٹی ایس ایلیٹ کی ''Notes Towards the Defination of Culture'' تک متعدد کتابیں مل جاتی ہیں۔ کلچر کے ضمن میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ اس لفظ کے متعدد استعمالات میں سے ایک ''Cultured pearl'' بھی ہے، نقلی موتی مگر اصلی جیسا چمکیلا، کلچر کے ایک معنی کا تعلق میڈیکل سے بھی ہے۔ نستعلیق اور مرصع شخص بھی کلچرڈ کہلاتا ہے۔ اس لفظ کے مختلف معانی اور اسی نسبت سے اس کے مختلف استعمالات کے باعث خود انگریزی میں بھی کلچر کی جامع تعریف نہیں کی جا سکی۔

مخصوص جغرافیائی خطے میں آباد کسی قوم، نسل، عقیدے، مذہب یا تصوف کے حامل افراد کی کثیر تعداد کے اجتماعی رویوں اور ان سے وابستہ اعمال، روحانی افکار، معاشرتی معیار اور تخلیقات کے جوہر کو تہذیب کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اسی سے اقدار و معیار حاصل ہوتے ہیں، جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسلمات میں تبدیل ہو کر قدغنوں، امتناعات اور ٹیبوز کی تشکیل بھی کرتے ہیں۔ قومی تشخص کے بہترین عناصر یعنی اس کی جمالیات، روحانیات اور اخلاقیات کا جوہر تہذیب کا حصہ بن کر نہ صرف محفوظ ہو جاتے ہیں بلکہ رنگ ثبات بھی حاصل کر لیتے ہیں۔

کلچر اور تہذیب باہم اثر اندازی سے معاشرے کے ارتقا کے سفر کے ضامن بنتے ہیں۔ تہذیب میں کلچر کی اعلیٰ صفات شامل رہتی ہیں۔ تہذیب اگر کسی قوم یا نسل کا اجتماعی ماضی ہے تو کلچر اس کا حال اور یہ دونوں ہی قوموں کے لیے لازم ہیں کہ یوں ماضی (تہذیب) اور حال (کلچر) مصافحہ کرتے ہیں۔ ماضی حال کو کس حد تک متاثر کرتا ہے اس کا اندازہ صرف اس ایک مثال سے لگایا جا سکتا ہے۔

ہمارے ہاں بل دار پگڑی پر طُرّہ عام ہے، جو ہزاروں برس قبل ناگ پوجا اور ناگ بھگت ہونے کا اظہار تھا، بل دار پگڑی اور طُرّہ پھن پھیلائے ناگ کی گویا زندہ تصویر تھا۔ اس

انداز کی متعدد مثالیں تلاش کی جاسکتی ہیں، جو حال میں مستعمل ہیں مگر قدیم کا ورثہ ہیں۔ جہاں تک کلچر کا تعلق ہے تو بالعموم اسے تہذیب سے جداگانہ اور خودکار سمجھا جاتا ہے لیکن ایسا نہیں، کلچر تہذیب کی وہ متحرک صورت ہے جس کا اظہار روزمرہ کی زندگی سے ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے تو کلچر کو تہذیب کی ضمنی پیداوار بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ تہذیب اور کلچر کے باہمی تعلق کو اس سادہ سی مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ تہذیب وہ منبع (جھیل یا گلیشیر) ہے جہاں سے دریا نکل کر ہم تک پہنچ کر ہمیں سیراب کرتا ہے، سیرابی کا یہ عمل کلچر سمجھا جاتا ہے۔ کلچر قوم کے لیے کردار و عمل کے سانچے مہیا کرتا ہے جبکہ قوم اپنے کردار و عمل، ردوقبول اور ترمیم و تنسیخ کی صورت میں کلچر کے سانچوں میں تبدیلیاں پیدا کرتی ہے۔ یہ تبدیلیاں یا تو خارجی اثرات کی مرہونِ منت ہوتی ہیں یا پھر ان کی نفسیت ان کے مسترد کیے جانے کا باعث بنتی ہے۔ یوں کلچر اور افراد باہمی تبدیلیوں کے ذریعے سے خوب سے خوب تر کا سفر جاری رکھتے ہیں۔ ترمیم و تنسیخ اور ردوقبول سے عمل تغیر جاری رہے تو اس کے نتیجے میں کلچر متحرک، صحت مند اور توانا رہے گا ورنہ بصورتِ دیگر کھڑے پانی والے جوہر جیسا جامد، مردہ اور متعفن۔ ہر قوم اور نسل کا کلچر دوسری قوم اور نسل سے منفرد بلکہ مختلف اور برعکس ہوسکتا ہے اور اسی میں قوم یا نسل کی انفرادیت ہے۔ اسی لیے کلچر مختلف تو ہوسکتا ہے مگر غلط نہیں۔ جنوبی امریکہ کے رین فارسٹ میں بے لباس رہنے والا قبیلہ اپنے کلچر میں اتنا ہی درست ہے جتنے کہ ہم! کلچر خواہ کتنا ہی توانا کیوں نہ ہو لیکن تہذیب کی صورت میں وہ اپنے ماضی سے منقطع نہیں ہوسکتا۔ کلچر میں تہذیب اسی طرح جاری و ساری ہوتی ہے جیسے پرزم میں دھنک کے رنگ۔

زندہ کلچر، فعال کلچر، توانا کلچر، متحرم کلچر جیسے الفاظ دراصل اس کلچر کے لیے استعمال ہوتے ہیں جو افراد کے لیے سودمند ثابت ہو، اسی سے یہ بحث جنم لیتی ہے کہ کیا کلچر افراد کے لیے ہے یا افراد کلچر کے لیے؟ وہی ٹوپی اور سر والی پرانی بحث۔ اسے یوں سمجھئے کہ عمومی قبولیت کی صورت میں افراد کلچر کے ارفع پہلوؤں کو تقویت دیتے ہیں جبکہ ترمیم و تنسیخ کی صورت میں

کلچر کے منفی اثرات کو مسترد کرتے جاتے ہیں۔ اسی لیے کلچر کے سانچے معاشرتی رویوں سے مشروط ہوتے ہیں۔ اگر معاشرہ منفی کو مسترد نہ کرے تو ایسا کلچر مسموم ثابت ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ڈرگ کلچر، کلاشنکوف کلچر، تھانہ کلچر، لینڈ مافیا کلچر، بیوروکریسی کلچر، قبضہ گروپ کلچر جیسے الفاظ پاکستانی کلچر میں منفی کارفرمائی کے مظہر ہیں۔ قوم جب اعلیٰ سطح سے گرے تو اچھے الفاظ کے معانی بھی پست سطح پر گر کر قوم کے اجتماعی رویوں کے غماز بن جاتے ہیں۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے تو یہ خلا میں تخلیق نہیں ہوتا۔ ادیب کا جس قوم سے بھی تعلق ہو اس کی تخلیقات میں اس قوم کے ماضی (تہذیب) کے ساتھ ساتھ حال (کلچر) سے بھی اس کا رشتہ استوار ہوتا ہے۔ تخلیق میں تہذیب یا کلچر کا براہِ راست اظہار نہ بھی ہو، لیکن بالواسطہ طور پر اجتماعی شعور کی صورت میں ان کی عکاسی ہوتی رہتی ہے۔ غزل اس کی بہت اچھی مثال پیش کرتی ہے۔ غزل گو غزل میں ماضی (تہذیب) سے جو رشتہ استوار رکھتا ہے اس کا اظہار تشبیہات، استعارات اور تلمیحات سے ہو جاتا ہے۔ کلچر کی تشکیل میں خطے کا جغرافیہ اور لینڈ سکیپ بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں چنانچہ خطے کے دریا، درخت، پھول، پھل، چرند پرند اور درندے تک تشبیہات اور استعارات فراہم کرتے ہیں۔ اُردو غزل کی تشبیہات و استعارات اس ضمن میں بہت اچھی مثال پیش کرتے ہیں۔ اردو غزل ہند ایرانی کلچر کی پروردہ تھی، اس لیے اس میں ایران کے جغرافیے کے ساتھ ساتھ ایرانی تلمیحات بھی ملتی ہیں۔

غزل کے ساتھ ہی داستانوں، مثنویوں اور قصائد کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے۔ داستانیں پُر آسائش زندگی سے مشروط تھیں۔ داستان گوئی پیشہ تھی جبکہ داستان سننا کلچرڈ ہونے کی نشانی تھی۔ غالب کو بھی داستان سننے کا شوق تھا اور وہ اپنے گھر پر داستان گوئی کی محفلوں کا انعقاد بھی کرتے تھے۔ ''بوستان خیال'' غالب کی پسندیدہ داستان تھی۔ وہ ''فسانۂ عجائب'' کے مقابلے میں ''باغ و بہار'' کو پسند کرتے تھے۔ داستان کے رسیا تمام رات داستان سنتے اور پلک نہ جھپکتے۔ فراغت اسی کلچر میں ممکن تھی، وہ کلچر جو اشرافیہ سے مخصوص تھا۔ قصیدے کا دربار،

بادشاہ اور انعام/ صلہ سے تعلق تھا۔ اس لیے اس میں مبالغہ جائز اور پسندیدہ تھا کہ مقصد بادشاہ کو خوش کر کے زیادہ سے زیادہ انعام حاصل کرنا تھا۔ جیسے ہی دربار منسوخ اور بادشاہت متروک ہوئی تو قصیدہ نے بھی اپنی اہمیت اور معنویت گنوا دی۔ زمانہ بدلا تو حکمرانی کا انداز بھی تبدیل ہوا اور اسی کی مناسبت سے قصیدہ کا اسلوب بھی تبدیل ہوا۔ قصیدہ آج بھی کہا جاتا ہے لیکن کالم کی صورت میں۔ مثنوی جس کلچر کی پروردہ تھی وہ کلچر نہ رہا تو مثنوی بھی ختم ہوگئی۔ اب شجاع شہزادوں، خوب صورت شہزادیوں اور جنوں، بھوتوں سے کسی کو بھی دلچسپی نہیں۔ حقیقت نگاری کے عہد میں مافوق الفطرت کا کیا کام؟

انگریز آئے تو اپنے ساتھ اپنی زبان اور اپنا کلچر بھی لائے۔ 1857ء کے بعد مشرقی اور مغربی کلچر میں موازنہ، مقابلہ اور ترجیح کے جس عمل کا آغاز ہوا آج بھی کسی نہ کسی صورت میں اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ مشرق بمقابلہ مغرب کی آویزش بھی جاری ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے مروج کلچر کا دفاع کیا جبکہ سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء مغرب کے قائل تھے۔ انہوں نے بھی اصناف ادب (ناول، انشائیہ) کو حال کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ ڈپٹی نذیر احمد کا ''ابن الوقت'' 1857ء کے بعد کے حالات ہی میں لکھا جاسکتا تھا، آج نہیں۔ اس وقت تبدیلی وضع ایک نوع کی ''کلچرل شاک'' تھی۔ آج کے گھمبیر مسائل میں سوٹ، ٹائی، میز، کرسی اور ڈبل روٹی سرے سے مسئلہ ہی نہیں۔ آج ہم ''ابن الوقت'' سے کہیں زیادہ مغربی بننے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اب اجتماعی خواب گرین کارڈ کا حصول ہے۔ کلچر کی تبدیلی سے انداز زیست تبدیل ہو تو ادب اور ادبی تخلیقات بھی تغیر آشنا ہوتی ہیں۔ علامہ اقبال نے کہا تھا:

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

''آئین'' کو کلچر سے تبدیل کر دیں تو بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچتی ہے۔ ادبی تخلیق اگرچہ

فردِ واحد کا کارنامہ ہوتی ہے لیکن تخلیق قوم اور اس کے کلچر سے ماورا نہیں ہوتی۔ اعلیٰ تخلیق معاشرہ اور قوم کے لیے ترفع کا باعث بن سکتی ہے۔ جیسے اقبال کی شکوہ، جواب شکوہ اور مسجد قرطبہ ایسی نظمیں ہیں جن کے مطالعہ سے بے معنی زندگی گزارنے والے بھی ترفع کے احساس سے بالیدگی حاصل کر سکتے ہیں۔ ولی، میر، درد، آتش اور غالب آج بھی کیوں بامعنی ہیں؟ اس لیے کہ انہوں نے جو کچھ کہا وہ آج کے کلچر میں بھی درست ثابت ہوتا ہے۔ جس تہذیب سے ان کا تعلق تھا ہمارا بھی وہ ماضی ہے، اس لیے اپنی غزل کے ذریعہ سے وہ آج بھی ہم سے مکالمہ کر سکتے ہیں اور اسی لیے وہ ''زندہ'' ہیں۔

بڑے تخلیق کار کم ہوتے ہیں جبکہ اکثریت زمانے کی گردش میں گرد راہ ثابت ہوتی ہے۔ زندہ تخلیق کار بڑی تخلیقی شخصیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ایسی بھرپور شخصیت جس کا ماضی (تہذیب) اور حال (کلچر) دونوں سے تعلق ہوتا ہے۔ تہذیب سے اجتماعی شعور حاصل کرتے ہیں جبکہ کلچر حال کے تقاضوں کا احساس کراتا ہے۔ قوم کے تشخص کے تعین میں دو عناصر اساسی کردار ادا کرتے ہیں۔ مذہب پر استوار روحانی اقدار اور اخلاقیات اور دوسری جمالیات جس کا اظہار فنونِ لطیفہ سے ہوتا ہے۔ دنیا کے بیشتر کلچرز میں مذہب اور جمالیات میں مغائرت نہیں ملتی بلکہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر اثر انداز نہ بھی ہوں تو متوازی کناروں کی مانند اپنی انفرادیت برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اس ضمن میں ہندوستان بہت اچھی مثال ہے، جہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے باوجود بھی پانچ ہزار برس قدیم اساطیر کے مطابق زندگی بسر ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں ایشوریا رائے کی اصل شادی سے پہلے درخت سے شادی کی مثال دی جا سکتی ہے۔ یہ سب اس بنا پر ضروری تھا کہ ایشوریا ''منگلی (منگل، یعنی مریخ کے زیر اثر) تھی اور مریخ کے نحس اثرت دُور کرنے کے لیے شجر کو شوہر بنانا ضروری تھا۔

روحانی اقدار اور اخلاقیات کی صورت میں مذہب کو افراد و طبقات کو باہم پیوست کرنے والی قوت ہونا چاہئے۔ لیکن ہمارے ہاں اس کا رواج نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے

مسلمانوں سے پوچھا تھا:

یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

ہمارا جواب آج بھی نفی میں ہے۔ یہی نہیں بلکہ خودکش حملوں، مساجد میں نمازیوں پر گولیاں برسانے جیسے واقعات سے عملاً اس کی تصدیق مزید بھی کرتے رہتے ہیں۔

پاکستان میں Uni Culture (واحد کلچر) ہے جبکہ ہمارے برعکس امریکہ اور ہندوستان Multi Cultures کے حامل ہیں۔ واحد کلچر سے مقابلہ یا موازنہ کے لیے دوسرا کلچر نہیں ہوتا اس لیے واحد کلچر نرگسی کلچر میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ نرگسی کلچر خود کو ہمیشہ خطرات میں گھرا محسوس کرتا ہے اس لیے وہاں افکارِ نو خطرے کی سرخ روشنی کے مترادف ہوتے ہیں اور افکارِ نو سے دوری کی نسبت سے ماضی کا Cult بنا کر گویا اس کی پرستش کی جاتی ہے۔ حال چونکہ ماضی کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے اس لیے ایسا کلچر بالعموم خسارے کا کلچر ثابت ہوتا ہے۔ واحد کلچر میں برداشت اور رواداری نہیں ملتی اس لیے کہ اس کلچر میں صرف خود کو صحیح، درست اور جائز سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے دوسرے کو مسترد کردینے کا رجحان قوی تر ثابت ہوتا ہے۔ بحیثیت مجموعی واحد کلچر کے افراد Xenophobia کا شکار ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے تصورات، عقائد اور شعائر سے مطابقت نہ رکھنے والا ہر تصور، عقیدہ اور شعار غلط اور گمراہ کن اور اسی لیے ناپسندیدہ معلوم ہوتا ہے۔

واحد کے برعکس ملٹی کلچر چونکہ کئی کلچرز سے تشکیل پاتا ہے اس لیے اس میں برداشت اور رواداری ملتی ہے۔ اس کلچر میں خود سے برعکس کو مسترد کرنے سے پہلے اس کی تفہیم کی سعی کی جاتی ہے۔ اس کلچر میں جمہوری اقدار کے فروغ کے لیے نسبتاً زیادہ گنجائش ہوتی ہے۔ آزادی اظہار کے نتیجے میں فنونِ لطیفہ اور ادبی تخلیقات قدغنوں سے آزاد ہوتی ہیں۔ کسی بھی کلچر میں زبان اور زبانیں رابطے اور تخلیقی اظہار کے لیے اساسی آلہ کی صورت میں بھرپور کردار ادا کرتی

ہیں جبکہ میتھیو آرنلڈ کے بموجب تخلیقی فعلیت سے کلچر کے فاسد عناصر کے مقابلہ میں صحت مند خیالات کی رو موجزن رہتی ہے۔ دیکھا جائے تو اسی میں تخلیقات کا جواز مضمر ہے۔ ادب تفریح طبع کے لیے رنگین کھلونا نہیں بلکہ سنجیدہ اذہان کی بہترین صلاحیتوں کا اظہار ہے۔ اس لیے ہر کلچر میں تخلیق اور تخلیق کار کو قابلِ قدر سمجھا جاتا ہے۔ دراصل اعلیٰ تر تخلیقی فعلیت ہی سے قومی تشخص کے خدوخال میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ یہ تخلیقات ہی ہیں جو آئینہ بن کر قوم کو اس کے جمال کا نظارہ کراتی ہیں۔ یاد رہے کہ کبھی کبھی یہ آئینہ Distorting Mirror میں تبدیل ہوکر قوم کے نرگسی آئینے سے متصادم ہوسکتا ہے۔ تصادم کے اس موقع پر نقاد کے کام کا آغاز ہوتا ہے، جو قوم کی ادبی تقدیر کے تناظر میں معاصر تخلیقی کاوشوں کی معیار بندی کرتا ہے۔ اگر اچھا نقاد میسر نہ ہو تو بھی زمانہ نقاد کا کردار ادا کرتا ہے۔ وہ کردار جس کے بارے میں علامہ اقبال نے یہ کہا تھا:

تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب، صیرفیِ کائنات
تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات